(قسط ۲)

الفرّاء اور اُس کی تفسیر معانی القرآن

احمد خان فیلو ادارۂ تحقیقات اسلامی

فراء کی افادی زندگی

سیبویہ کے کسائی کے ساتھ مناظرے کے بعد بھی فراء کچھ عرصہ تک اپنے اُستاد کے ہاں مقیم رہا۔ بعد میں وہ کسائی کے ایک رفیق کی حیثیت سے الگ منفرد زندگی بسر کرنے لگا۔ اب وہ ایک مکمل عالم بن چکا تھا۔ اور اسی طرح بدوی قبائل اور فصحاء عرب سے ملاقات نے اس کے ذوقِ زبان وادب کو کافی حد تک مکمل کر دیا تھا۔ چنانچہ اب وقت آگیا تھا کہ لوگ اس سے بھی باقاعدہ تلمذ کریں۔ اس کے گرد ایک حلقہ معتقدین جمع ہو گیا جو اس سے نحو، لغت اور قرآن کی تعلیم حاصل کرتا تھا۔

فراء جب کسائی کے حلقۂ تلامذہ داخل تھا تو اُس وقت ہی لوگوں نے اس سے استفادہ شروع کر دیا تھا۔ اسحاق بن ابراہیم الموصلی کہتے ہیں کہ میں مُنہ اندھیرے اُٹھتا ہُشیم سے حدیث سنتا، پھر کسائی کے پاس تھوڑا سا قرآن پڑھتا۔ اور بالآخر قرآن (غالباً تفسیر) کا کچھ حصہ فراء سے جاکر پڑھا کرتا تھا۔ (ادباء ۱۹۸/۳)۔

بعد میں فراء نے اپنے اُستاد کی طرح اپنا ایک حلقہ درس قائم کر لیا۔ اس حلقے میں کئی قسم کے علوم کا درس ہوتا تھا۔ جن میں علوم القرآن، حدیث، فقہ، نحو اور دواوین عرب کی تعلیم شامل تھی۔ اور یہ درس عموماً مسجد میں ہوتے تھے۔ انہی مجالس کے دوران کئی لوگوں کی فراء سے ملاقات ہوئی جو اس کے طریقِ تدریس پر کافی روشنی ڈالتے ہیں۔

دربارِ خلافت سے وابستگی

فراء ہارون الرشید کے عہد میں دربارِ خلافت میں باریابی حاصل کر چکا تھا۔ دربار میں اُس کی حاضری کی ایک مجلس کا ذکر کرتے ہوئے قُطرب لکھتا ہے:۔ فراء ہارون الرشید کے دربار میں حاضر ہوا۔ اور جب اُس نے گفت گو کی تو اُس میں لحن تھا۔ جعفر بن یحییٰ برمکی نے ہارون سے کہا کہ یہ لحن کرتا ہے۔ ہارون

نے فراء سے پوچھا تو اُس نے کہا کہ بدوؤں کے ہاں اعراب بے لحن نہیں، اہل شہر لحن کرتے ہیں۔ جب میں احتیاط سے بولتا ہوں تو لحن نہیں کرتا۔ لیکن جب اپنی اصل طبیعت کی طرف لوٹتا ہوں تو لحن کرتا ہوں۔ (وفیات الاعیان ۵/۲۲۵) معلوم ہوتا ہے کہ یہ اُس وقت کا واقعہ ہے جب فراء بدوی قبائل میں پھر پھرا کر اور صحتِ زبان میں کاملیت پیدا کر کے واپس آیا تھا۔ اس تبحرِ علمی کے سبب فراء کو دربار میں بار مل گیا۔ اگرچہ ہارون الرشید کے ساتھ اُس کی کسی اور مجلس کا تذکرہ نہیں ملتا مگر قیاس کہتا ہے کہ وہ دربار میں وقتاً فوقتاً ضرور جاتا ہوگا کیونکہ اگر کوئی شخص خلفاء کے ہاں شرفِ باریابی حاصل کر لیتا تھا تو اُسے اس وقت تک دربار سے نکالا نہ جاتا تھا جب تک کہ اس سے کوئی ناخوشگوار فعل سرزد نہ ہو۔ چنانچہ اس بنا پر اندازہ یہ ہے کہ فراء رشید کی وفات (۱۹۲ھ) تک دربارِ خلافت سے متعلق رہا۔ ہارون الرشید کے جانشین الامین کے ساتھ اُس کی کسی ملاقات کا تذکرہ نہیں ملتا (معانی القرآن ۱/۹)۔ ممکن ہے فراء اس عہد میں بھی دربار سے منسلک رہا ہو مگر شاید اس دَوران کوئی اہم کام اُس نے سرانجام نہ دیا ہو۔ اس لئے اس کا ذکر نہ آ سکا۔ یا یہ دَور چونکہ فتنہ و فساد کا دَور تھا۔ اور اس میں امین اور مامون کی باہمی چپقلش زوروں پر تھی اس لئے فراء نے کسی سے منسلک ہونا خلافِ مصلحت سمجھا ہو۔ مگر جب اس فتنہ کے بعد مامون کامیاب ہوگیا تو فراء اس کے قریب ہوگیا۔

سب کو معلوم ہے کہ مامون کے دربار میں معتزلین کو قرب حاصل تھا اور گو فراء نے علم کلام کا حصول تو کیا تھا مگر اس پر اعتزال کا پورا رنگ نہیں چڑھا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مامون کے ہاں جانے میں وہ ہچکچاہٹ محسوس کرتا تھا۔ اس دَوران اس نے ثمامہ بن الاشرس سے ملاقاتیں شروع کر دیں۔ اور ان کے دَوران اپنے علم کی دھاک بٹھا دی۔ پھر ثمامہ نے مامون کے ہاں فراء کے تبحرِ علمی کا تذکرہ کیا۔ اس نے فوراً فراء کو اپنے ہاں بلا لیا۔ اس طرح فراء دربارِ شاہی میں پھر داخل ہوگیا۔ اور مامون کے دونوں بیٹوں کا اتالیق مقرر ہوا۔ اس مشہور واقعہ سے سب باخبر ہیں جس میں فراء کے جوتے لانے کے لئے دونوں شاہزادے آپس میں جھگڑ پڑے تھے۔ اس بات کی خبر مامون کو ہوئی تو اس نے فراء کو دربار میں بلا بھیجا۔ اور اس سے پوچھا کہ لوگوں میں سب سے مکرم کون ہے؟ فراء نے جواب دیا: امیر المومنین۔ اس پر مامون نے کہا کہ وہ شخص زیادہ مکرم ہے جس کے جوتے پیش کرنے کے لئے دو ولی عہد آپس میں جھگڑ پڑتے ہیں۔ (نزہتہ الالباء: ۱۳۰)۔ مامون نے فراء کو اس موقع پر دس ہزار درہم بطور انعام دیئے۔ (البدایۃ والنہایۃ: ۱۰/۲۶۱)۔

اس کے بعد مامون کی نظر میں فراء کا وقار اور بھی بلند ہوگیا۔ اس نے فراء کو نحو کے اُصول مرتب

کرنے اور جو کچھ اس نے اعراب سے سن رکھا تھا، جمع کرنے کے لئے کہا۔ اس کے لئے ہر قسم کی آسائش مہیا کی۔ اور اس کے ساتھ کئی کاتب لگا دیئے۔ چنانچہ وہ اپنی کتاب لکھنے میں مشغول ہو گیا۔ وہ اس تالیف میں، جس کا نام کتاب الحدود تھا، اس قدر محو ہوا کہ اسے نماز اور کھانے کے اوقات سے باندیاں مطلع کیا کرتی تھیں، جب یہ کتاب تیار ہوئی تو مامون نے اسے دوسری لائبریریوں کے لئے بھی لکھوا لیا۔ (نزہتہ الالباء، ۱۲۸)۔

ابن الندیم نے کتاب الحدود کی تالیف کی وجہ بالکل دوسری بیان کی ہے۔ کہتا ہے کہ کسائی کے شاگردوں میں سے کچھ لوگ فراء کے پاس پہنچے اور اس سے خواہش ظاہر کی کہ وہ انہیں نحو کے شواہد لکھوائے۔ فراء نے ان کی اس درخواست کو مان لیا۔ یہ سلسلہ ابھی چند مجالس تک چلا تھا کہ ایک مجلس میں یہ لوگ کھسر پھسر کرنے لگے کہ اگر یہ شخص اسی طرح ہمیں بچوں کی طرح تعلیم دیتا رہا تو ہم سے برداشت نہیں ہو گا۔ اس پہ فراء کو غصہ آ گیا۔ اس نے کہا کہ: انھوں نے مجھے اس کام کے لئے تیار کیا۔ جب میں راضی ہوا تو یہ تنگ آ گئے۔ خدا کی قسم۔ اب میں نحو کے بارے میں سب کچھ جمع کر دوں گا۔ چنانچہ وہ سولہ سال تک یہ کتاب الحدود لکھواتا رہا۔ (الفہرست: ۹۹)۔ پھر ابن الندیم نے اس کتاب کے مشتملات کی تفصیل دی ہے، افسوس ہے کہ یہ کتاب دست برد زمانہ کی نذر ہو گئی۔

فراء کا مذہب

جس عہد میں فراء نے آنکھیں کھولیں، اس میں علم کلام ترقی کر کے باقاعدہ ایک علم کی حیثیت اختیار کر چکا تھا۔ چنانچہ فراء بھی علم کلام کے اثرات سے نہ بچ سکا، وہ اپنی تصانیف میں فلسفیانہ خیالات کا نہ صرف اظہار کرتا بلکہ فلاسفہ کی اصطلاحات بھی استعمال کرتا (الفہرست، ۹۹، ادباء: ۲۷۷/۷)۔

اس کے اعتزالی رنگ کا اظہار اس کی تفسیر معانی القرآن سے بھی ہوتا ہے۔ اس کی طرف انسائیکلوپیڈیا آف اسلام (طبع جدید) میں مقالہ نگار نے اشارہ کیا ہے۔ مگر خیال ہے کہ اس وقت معتزلہ کے کچھ معتقدات اس قدر عام ہو گئے تھے کہ ہر شخص ان کا قائل تھا، چاہے وہ معتزلی ہو یا غیر معتزلی۔ بعد کے ادوار میں جب معتزلہ پہ باقاعدہ لکھا جانے لگا تو ان خیالات کے کسی حصہ کے حامل کو معتزلہ کہہ دیا گیا۔ خواہ وہ شخص اپنے وقت میں اعتزال سے بیزار ہی تھا۔ یہی معاملہ فراء کے ساتھ بھی ہوا۔ بلاشبہ اس نے مامون کے عہد میں زندگی بسر کی۔ کئی مرتبہ دربارِ خلافت میں حاضری بھی دی۔ مگر اس سارے عرصہ میں کبھی معتزلی معتقدات پر نہ تو اس کا مذاکرہ ہوا اور نہ بحث

جاحظ جو معتزلہ کا بہت بڑا ستون تھا، آخری عمر میں بغداد آیا۔ زبان وادب کے ماہر اور اعتزالی خیالات کے حامی ہونے کی وجہ سے لوگ اس پر پروانہ وار ٹوٹ پڑے۔ اس کے ارد گرد شائقینِ علم کا جمگھٹا لگ گیا۔ وہ اُنھیں زبان وادب کے علاوہ معتزلہ معتقدات کا درس بھی دیتا تھا۔ اس سے بہت سے لوگ متاثر ہوئے۔ چنانچہ فرار بھی جو ہمیشہ طلبِ علم میں کوشاں رہتا تھا، اس کے ہاں پہنچا اور اس کی اس طرح تعظیم و منزلت کرنے لگا جس کا کہ جاحظ مستحق تھا۔ فرا، جاحظ سے بے حد محبت کرتا تھا، مگر اس کے اعتقادات سے فرار کو سخت نفرت تھی۔ جاحظ نے دیکھا کہ فرا، بہت ہی ذہین شخص ہے۔ اسے اعتزال کے رنگ میں رنگنا چاہئے چنانچہ جاحظ نے بہتیری کوشش کی مگر کامیاب نہ ہو سکا، دیکھئے کس حسرت سے کہتا ہے، جب مامون ۲۰۴ھ کو بغداد آیا تو میں بھی وہاں حاضر ہوا۔ فرا مجھ سے محبت کرتا تھا، اور میں چاہتا تھا کہ وہ مجھ سے علم کلام پڑھ لے، لیکن اُس کا ادھر میلان نہ تھا۔ (وفیات ۵/۲۲۸)

احمد بن یحییٰ بن المرتضیٰ نے معتزلہ کے طبقات پر ایک جامع کتاب لکھی ہے۔ فرار کے دَور کے معتزلہ کو اس نے طبقہ سابعہ میں رکھا ہے۔ جن میں سے مشہور ثمامہ بن الاشرس، جاحظ اور عیسیٰ بن صبیح وغیرہ کا تذکرہ کیا ہے۔ مگر ان کے ضمن میں بھی فرار کا ذکر نہیں آیا۔

معانی القرآن کے اندر جن چند مقامات کا اشارہ انسائیکلو پیڈیا آف اسلام (طبع جدید) کے مقالہ نگار نے مقالہ بعنوان فرا میں کیا ہے، اس کے بارے میں واضح ہونا چاہیئے کہ معانی القرآن اُس کے آخری ایام کی تصنیف نہیں ہے۔ بلکہ وہ اُس کی پنتالیس سے پچپن سال کی عمر کے درمیان کا حاصل ہے۔ مگر اعتزال سے سخت بے زاری پچپن سال کے بعد ہوئی ہے۔ معتزلہ کا قول ہے کہ اس آیت (الرحمٰن علی العرش استویٰ) میں استویٰ کی قرأت صحیح ہے۔ ثعلب نے لکھا ہے کہ استویٰ کے بارے میں دو اقوال ہیں۔ ایک "استویٰ" جو عام ہے۔ اور دوسرا استوی جو معتزلہ کا قول ہے۔ (مجالس ثعلب: ۲۶۹)۔ مگر لسان العرب میں ہے کہ فرار نے ان دونوں خیالات کے علاوہ ایک تیسری شکل بتائی ہے اور وہ ہے، آمد تقول کا مہ مقبلاً علی نلالہ ثم استوی علی دالی یشا تمنی علی معنی اُقبل إلیّ وعلیّ (حاشیہ مجالس ثعلب: ۲۶۹)۔

مندرجہ بالا وجوہ کے بعد جو شخص فرار کو اعتزال کی طرف مائل کہتا ہے، وہ صرف اس کی زندگی کے ناپختہ ایام پر فیصلہ دے رہا ہے اور فرار کی زندگی کے آخری ایام سے ناواقف ہے یا کم از کم اس تک صحیح طور پر پہنچ نہیں سکا ہے۔

فراء ایک نحوی ولغوی

"اگر اہل بغداد کو کسائی اور فراء کے علاوہ اور کوئی عالم میسر نہ آتا تو ان کے لئے یہی دونوں تمام دنیا پر فخر کے لئے کافی تھے"۔ (نزہۃ الالباء ۱۲۴، تہذیب التہذیب ۱۱/۲۱۲)۔ نحو کے مکتب کوفہ کی بنیاد کسائی نے رکھی ہے۔ اس نے اس کے لئے ابتدائی مواد جمع کیا اور فراء نے اس مواد سے اس کی نہ صرف تکمیل کی بلکہ اسے ایک مکتب نحو کی حیثیت سے امتیازی شان بخشی۔ اور اس مواد کو جدید علمی منہج پر ترتیب دے کر اس میں جان پیدا کر دی (مدرسۃ الکوفۃ ۱۲۷)۔ فراء کے بارے میں کہا گیا ہے کہ وہ امیر المومنین فی النحو تھے (تہذیب التہذیب ۱۱/۲۱۲)

اہل کوفہ کہا کرتے تھے [illegible] ابو حنیفۃ وابو یوسف ومحمد بن الحسن ولنا ثلاثۃ نحویین [illegible] ابو الحسن علی بن حمزۃ الکسائی وابو زکریا یحیی بن زیاد الفراء وابو العباس احمد بن یحیی ثعلب (ادباء ۲/۱۵۲)

سیوطی کا قول ہے کہ [illegible] ما علمنا ما نحو بعده (المزھر ۲/۴۰۲)

جس طرح بصری مکتب نحو کے بانی خلیل تھے اسی طرح ہی کوفی مکتب نحو کے ابوجعفر رؤاسی بانی تھے سیبویہ کے مقابل میں کوفہ کے کسائی و فراء تھے۔ (مدرسۃ الکوفہ ۶۷)۔ نحو کے مکتب کوفہ میں [illegible] حاصل کیا ہے۔ اس کے بارے میں المخزومی نے اپنی کتاب "مدرسۃ الکوفۃ فی النحو" میں نہ صرف ایک مستقل باب [illegible] ہے بلکہ کتاب کے تقریباً ہر صفحے پر فراء کے احسانات گنائے ہیں۔

فراء نے کسائی کی تتبع میں نحو کے مکتب کوفی کی بیش قیمت خدمت کی ہے مگر اس سے ہرگز یہ مطلب [illegible] کہ فراء ان کا پیرو تھا بلکہ کئی مسائل میں اس نے کسائی سے اختلاف کیا ہے۔ اور [illegible] مسلک پوری طرح واضح کیا ہے۔ (طبقات نحویین ۱۹۰)

الغرض فراء نے [illegible] لغت اور علم نحو کی ایسی خدمت کی ہے جو [illegible]

متفرقات

[illegible] فراء نے اپنی عمر میں کوئی شعر نہیں کہا (طبقات النحویین ۱۹۰) [illegible]
اشعار ہیں جو فراء کی طرف منسوب کئے گئے ہیں۔ یہ اشعار ابن خلکان نے ذکر کئے ہیں (وفیات ۵/۲۲۹)
[illegible] مشتاق تھا۔ وہ کسب معاش سے [illegible]

اہل وعیال میں جمع شدہ رقم تقسیم کر دیتا۔ (وفیات الاعیان ۵/۲۲۸)

تعلیم کے دوران اس کا وطیرہ یہ تھا کہ دوسرے لوگوں کے ساتھ شیوخ کے ہاں طلب علم کے لئے جاتا مگر اس کے پاس کسی قسم کا کوئی کاغذ یا کتاب نہیں ہوتی تھی۔ یعنی سب کچھ حفظ کرتا تھا۔ اور جب کہیں کوئی اہم چیز جو حدیث یا تفسیر سے متعلق ہوتی، دوران درس آجاتی تو اپنے اُستاد سے گزارش کرتا کہ اسے دوبارہ فرمایئے گا۔ اور اس طرح اسے حفظ کر لیتا۔ (تاریخ بغداد: ۱۴/ ۱۵۲)

فرا کے حافظے کا یہ عالم تھا کہ اس نے تقریباً اپنی تمام تصانیف کی املا اپنے حافظہ سے کرائی ہے۔ یہ تصانیف تین ہزار اوراق پر مشتمل تھیں۔ پچاس اوراق پر مشتمل دو کتابیں لکھواتے وقت صرف چند اوراق اس کے پاس دیکھے گئے۔ (نزہتہ الالباء: ۱۳۵)

کسی بات کو سمجھانے کے لئے ہمیشہ ازحد کوشش کرتا تھا مگر جب شاگرد کوئی بات سمجھ نہ پاتا تھا تو اس پر کبھی ناراض نہ ہوتا بلکہ اسے اپنی ہی کمزوری گردانتا۔

فرا کے اقوال میں سے ایک یہ ہے: ارحم رجلین، فرجل یفہم ولا یطلب و رجل یطلب ولا یفہم۔

(مجالس ثعلب: ۱۵۹)

فرا کبھی اپنی خود ستائی نہ کرتا تھا اور نہ مدح کو پسند کرتا تھا۔ ایک مرتبہ فرا سعید بن مسالم کے پاس گیا اس نے کہا کہ: قد جاءکم سید أھل اللغۃ وسید أھل العربیۃ۔ تو فرا نے فوراً ٹوکا اور کہا کہ جب ...ئم میں اخفش موجود ہے، اس وقت تک اس خطاب کا کوئی اور مستحق نہیں۔ (ادباء ۲۰/ ۲۴۳)

معانی القرآن

رسول مقبول علیہ الصلوٰۃ والسلام کے اس دنیا سے اُٹھ جانے کے بعد ہر مسلمان کی خواہش ہوتی تھی کہ قرآن و ...یث کے بارے میں جو کچھ علم میرے سینے میں موجود ہے، وہ دوسرے تک پہنچ جائے۔ اسی طرح ہر مسلمان یہ ...شش کرتا تھا کہ جہاں کہیں سے کچھ علم کی بات میسر آجائے اسے اپنے ہاں محفوظ کر لے۔ چنانچہ یہ طریقہ ...لام کی ابتدائی دو ڈھائی صدیوں تک چلتا رہا۔ لوگ ادھر اُدھر طلب علم کی غرض سے سفر کیا کرتے۔ اگر کہیں ...فاصلے پر کسی شخص کے ہاں کسی علمی بات کا پتہ چلتا تو میلوں سفر کر کے اس تک پہنچ جاتا۔ اس دور میں علم ...وں میں محفوظ چلا آتا تھا۔ کہیں کہیں علماء حضرات اس علم کو مدون بھی کر دیتے تھے مگر ترجیح اسی علم کو ...اتی تھی، جو روایتہً دوسرے سے ملتا تھا۔ قرآنی علوم کو بھی اسی نہج پر مدون کیا گیا۔ تفسیر کے

اس طریقے کو روایتی تفسیر کہتے ہیں۔ اس طریق تفسیر میں مفسّر کے سامنے وہ روایات ہوتی تھیں، جو اس وقت تک صحابہ، تابعین اور تبع تابعین میں سینہ بہ سینہ چلی آتی تھیں۔ ان روایات میں معتد بہ حصہ احادیث کا بھی ہوتا تھا۔

تاریخ اسلام کی ابتدا ہی سے تفسیر کا یہ ڈھنگ پڑ گیا تھا کہ مفسّر ایک ایک سورت کو علی الترتیب لیتا اور آیت کے ایک ٹکڑے یا ساری آیت یا چند آیات کے مجموعے پر ٹھہر کر اس کا مطلب بیان کرتا۔ اسی طرح وہ اپنی شخصیت اُس تفسیر میں نمایاں کر دیتا تھا۔ اس قسم کی ترتیب وار آیات کی تفسیر سب سے پہلے کس نے کی، اس کے بارے میں دو ٹوک بات کہنا بہت دشوار ہے۔

احمد امین (ضحی الاسلام ۲/۱۴۱) کا میلان اس طرف ہے کہ فراء ہی وہ پہلا شخص ہے جس نے اس انداز کی تفسیر کا ڈھنگ ابتکار کیا تھا۔ مگر ہم دیکھتے ہیں کہ اس سے قبل لکھی جانے والی مطبوعہ تفسیر مجاز القرآن از ابوعبیدۃ معمر المثنیٰ کا بھی بالکل یہی انداز ہے۔ اس لئے فراء کے بارے میں یہ فیصلہ کہ وہی اس انداز کا خالق ہے، بے جا نظر آتا ہے۔

فراء سے قبل بہت سی تفاسیر لکھی جا چکی تھیں حتیٰ کہ سعید بن سعدۃ الاخفش اور یونس بن حبیب بصری کو جو فراء کے اُستاد تھے معانی القرآن کے نام سے تفسیر لکھنے کا شرف حاصل ہو چکا تھا۔ یونس ابن حبیب نے اس نام کی دو تفسیریں لکھی تھیں، جو معانی القرآن صغیر اور دوسری معانی القرآن کبیر کے نام سے موسوم تھیں۔ کسائی نے بھی ایک تفسیر لکھی تھی جس کا نام معانی القرآن تھا۔ ابوجعفر الرؤاسی نے بھی اسی نام کی ایک تفسیر لکھی تھی اور اس سے کافی عرصہ قبل مؤرج السدوسی نے بھی بالکل اسی نام کی تفسیر لکھی۔ ایک روایت کے مطابق [illegible] نے نحو کے انداز پر تفسیر لکھی تھی۔ (طبقات النحویین: [illegible]) مگر اپنی تفسیر میں فراء نے جن مسائل کی [illegible] کی ہے اس قسم کی تفسیروں میں اس کا پہلا نمبر ہے۔ [illegible] ویسے تو تیس[1] کے قریب کتابیں لکھی ہیں مگر تفسیر کے میدان میں معانی القرآن کے علاوہ المصادر فی [illegible]

---

[1] ان کتب کا تذکرہ آپ معانی القرآن مقدمہ کے علاوہ انسائیکلوپیڈیا آف اسلام کے مقالہ فراء میں بھی دیکھ سکتے ہیں مگر دو ایسی کتابیں ہیں جن کا تذکرہ ان کے دیوان میں ملتا ہے اور وہ ہیں عدد آی القرآن (دیکھئے [illegible] مخطوطات [illegible] اور دوسری ہے کتاب الادغام۔

الجمع و التثنیۃ فی القرآن، عدد آی القرآن اور المشکل الکبیر و المشکل الصغیر کے نام سے مختلف اوقات میں کتب و رسائل مدون کئے ہیں۔ اور تقریباً سبھی کی املا کرائی ہے۔

فراء کی بچی ہوئی چند کتب میں سے معانی القرآن بہت اہم کتاب ہے۔ قرآن کریم کی یہ تفسیر فراء نے اپنے شاگردوں کو لکھوائی تھی۔ اس کی املا کے دوران کسی کتاب سے مدد نہیں لی گئی۔ اور نہ ہی لکھواتے وقت فراء کے ہاتھ میں کوئی کتاب دیکھی گئی۔ سب کچھ اُس نے زبانی لکھوایا ہے۔

معانی القرآن کی تالیف کا ایک سبب ابن عماد الحنبلی نے یہ بتایا ہے کہ "فراء نے یہ کتاب المامون کی خواہش پر لکھی تھی"۔ مگر یہ سبب کسی طرح درست نظر نہیں آتا۔ اس لئے کہ مامون سے فراء کے تعلقات ۲۰۴ھ کے بعد قائم ہوئے۔ اور محمد بن الجہم کی شہادت کے مطابق تفسیر کی املا ۲۰۲ھ سے شروع ہو چکی تھی۔ اس لئے یہ کیسے ممکن ہے کہ مامون کی ملاقات سے پہلے ہی فراء نے معانی القرآن کی املا اس کی خواہش کے مطابق شروع کر دی ہو۔

اس ضرورت کے محسوس کرنے کے بعد جس کا ذکر عمر بن بکیر نے کیا تھا، فراء نے اپنے اصحاب کو جمع کیا اور قرآن کے مطالب کی املا کے لئے خواہش ظاہر کی۔ چنانچہ لوگ تیار ہو گئے۔ ان مطالب کے لکھوانے کے لئے ہفتے میں خاص دن مقرر کئے گئے۔ ان مقررہ ایام میں وہ سب جمع ہوتے اور فراء باقاعدہ تیار ہو کر سر پہ ایک بڑی ٹوپی پہن کر ان کو مسجد میں معانی القرآن لکھواتا۔ ایک شخص سے قرآن پڑھنے کے لئے کہا جاتا۔ پھر چند آیات کے بعد فراء اُسے ٹھہرنے کا حکم دیتا۔ تب وہ اس حصے کی نحوی و لغوی اور علم قرأت کی رو سے تشریح کرتا اور اس کے بعد دوسری آیت لے لیتا۔ اسی طرح معانی القرآن کو مکمل کیا گیا۔ (تاریخ بغداد ۱۴/۱۵۰، طبقات النحویین ۱۴۰)

معانی القرآن کے چار اجزاء تھے (الفہرست: ۹۹) اور سب اجزاء کا مجموعہ ایک ہزار اوراق تک پہنچتا تھا (طبقات النحویین: ۱۴۳ - ۱۴۶، وفیات الاعیان ۵/۲۲۶)۔ اس تفسیر کی املا کے لئے بے شمار لوگ جمع ہوتے (نزہۃ الالباء: ۱۲۸) جن میں سے نوّے کے قریب تو قاضی ہی ہوتے تھے (شذرات الذہب ۲/۱۹)۔

ابن خلکان کا بیان ہے کہ لم یُعمل مثله ولا یمکن لأحد أن یزید علیه (وفیات الاعیان: ۵/۲۲۶)

کہتے ہیں کہ جب معانی القرآن تیار ہوئی تو اس متاع بے بہا کو لوگوں نے عام کرنے سے روک دیا۔ اور کہا کہ جب تک لوگ پانچ اوراق کے عوض ایک دینار نہ دیں گے اس وقت تک اس

تفسیر کے اور نسخے تیار نہیں کئے جائیں گے۔لوگوں کے اس میلانِ طبع کا علم جب فراء کو ہوا تو اس نے سب کو بلا کر اس بخل سے باز رہنے کا حکم دیا مگر وہ نہ مانے۔ تب فراء نے غصہ کی حالت میں ایک دوسرے شخص کو مسجد میں بلایا اور خواہش مند حضرات کو تفسیر لکھوانے کی دعوت دی۔ پہلے دن ہی فرار نے "بسم اللہ" کی تشریح میں تقریباً ایک سو صفحات لکھوا ڈالے۔ اس واقعہ کی خبر جب پہلے کاتبین کو ہوئی تو اس خوف سے کہ پہلی تفسیر کی وقعت کم نہ ہو جائے وہ ضرورت مند حضرات کے لئے ایک دینار کے عوض دس اوراق لکھ کر دینے کے لئے آمادہ ہو گئے۔ (تاریخ بغداد: ۱۴/ ۱۵۰)

فرار کی نحوی، لغوی اور دیگر قسم کی کتب کے مطالعہ کے بعد ان تین چیزوں کا پتہ چلتا ہے جو فرار کے ذہن کی اجزائے ترکیبی کہلانے کی مستحق ہیں۔

۱۔ قرآن کریم: ایک دینی کتاب ہونے کے علاوہ فرار قرآن کی زبان و ادب سے بے حد متاثر تھے۔ وہ قرآن کے اعجاز لغوی کے پورے پورے قائل تھے۔ وہ اس خیال کے تھے کہ قرآن قریش کی زبان میں اُترا ہے جو مکروہ قسم کے لہجات سے پاک تھی۔ تفسیر کے دَوران ایک بات کی تائید میں جس قدر دوسری آیات کو فرار نے پیش کیا ہے اس قدر کسی مفسّر کے ہاں اتنی وافر تعداد میں شواہد قرآنی موجود نہیں ہیں۔

۲۔ مختلف قرارات: جس عہد میں فرار نے آنکھ کھولی، وہ قرارات کا عہد تھا۔ قرآن کے نزول پر صرف ڈیڑھ صدی گزری تھی۔ قرارات کے مختلف مکاتب اپنی اپنی خصوصیات کے ساتھ امتیازی شکل اختیار کر چکے تھے۔ مشہور قرار کے علاوہ چھوٹے چھوٹے بیسیوں قاری اپنا مقام پیدا کر چکے تھے۔ ابتدا میں مدینہ، کوفہ، بصرہ اور بعد میں بغداد ان قرار حضرات کا مرکز تھا۔ فرار کے جید اساتذہ میں سے الکسائی بذاتِ خود ایک ممتاز قاری تھے۔ یہ قرار حضرات نہ صرف قرارات کے مختلف طریقوں کی تعلیم دیتے تھے بلکہ اپنی پسندیدہ قرارات کے ثبوت کے لئے عقلی و نقلی دلائل بھی بہم پہنچاتے تھے۔ الغرض فرار کے چاروں طرف قرارات کا ایک چمن کھلا ہوا تھا۔ فرار نے بھی اس باغ سے اپنے حصہ کے پھول چن لئے۔ فرار نے جن قرارتوں کو لیا معانی القرآن میں جگہ دے کر اُن کو حیاتِ جاودانی بخش دی۔

۳۔ کلام عرب: جیسا کہ اوپر ذکر کیا گیا ہے، فرار بدوی قبائل میں صحتِ زبان کے علم کی خاطر کئی سال تک رہا۔ اس دَوران اس نے کئی قبائل کے نثری و شعری ادب کو حفظ کیا، یہی ادب آئندہ چل کر اُسے قرآ کی تفسیر میں اور دیگر کتب میں مدد معاون نظر آیا۔ وہ اپنی بات کی تائید میں مختلف قبائل کے ا

پیش کرتا ہے۔ اسی طرح مختلف لہجات کا ذکر کرکے ان کے اختلاف کو بھی واضح کرتا ہے۔ فراء کی کئی آراء کی بنیاد ہی یہ کلام عرب ہے۔ اس ادب میں تحریری و زبانی دونوں قسم کا ادب شامل ہے۔

یہی تینوں چیزیں "معانی القرآن" کی واضح خصوصیات ہیں۔ فراء کا طرزِ تفسیر یہ ہے کہ ایک یا چند آیات لے کر ان میں جس قدر قراءات کا اختلاف موجود ہے، اُنہیں اُن کے قراء کی طرف منسوب کرکے بیان کرتا ہے، پھر ہر ایک کی قراءۃ کے الگ الگ وجوہ پیش کرتا ہے۔ اس سلسلے میں اگر کوئی لغوی بحث کی ضرورت پیش آتی ہے تو اُسے بھی ذکر کرتا ہے۔ اور اپنے اقوال کی تائید میں قرآن، حدیث، اقوالِ عرب اور شعراء کے اشعار پیش کرتا جاتا ہے۔ قرآن کے اندر جو غریب الفاظ آئے ہیں، ان کی تشریح بھی مندرجہ بالا انداز پر کرتا ہے۔ چونکہ یہ وہ دور ہے جس میں انہی تینوں چیزوں کا زور تھا اس لئے تمام تفسیر میں عقلیت خال خال ہی نظر آتی ہے۔ فراء روایت لفظی کی طرف بہت دھیان دیتا تھا۔ (مدرسہ الکوفہ: ۱۷۱)

معانی القرآن کی طباعت

سن ۱۹۵۵ء کے اوائل میں احمد یوسف النجاتی اور محمد علی النجار کو جو فقہ، تفسیر اور عربی زبان وادب پر کامل عبور رکھتے تھے، اس کارِ جلیل کے لئے تیار کیا گیا۔ مگر ان سے قبل جناب محمد صغیر حسن المعصومی جو اس وقت ڈھاکہ میں ریسرچ سکالر تھے فراء کی اس تفسیر پر کام شروع کرچکے تھے۔ اس سلسلہ میں پروفیسر احمد امین مرحوم سے خط وکتابت بھی ہوئی تھی۔ بلکہ انہی کے ایما پر کام شروع کیا گیا۔ معصومی صاحب ڈیڑھ سال تک اس پر کام کرتے رہے۔ آپ کے پیش نظر نور عثمانیہ اور علامہ محمود شنقیطی کے نسخے تھے۔ مگر کام ابھی ابتدائی مراحل میں ہی تھا کہ قاہرہ سے معانی القرآن کی پہلی جلد چھپ کر آگئی۔ تو انھوں نے اس کام کو ترک کر دیا۔

ابھی تک اس تفسیر کی دو جلدیں طبع ہوئی ہیں تیسری جلد میں ایک تفصیل انڈیکس بھی ہوگا۔ پہلی جلد جو فروری ۱۹۵۶ء میں دار الکتب المصریہ سے چھپ کر تیار ہوئی، وہ ابتدائے قرآن سے سورۃ یونس تک کی تفسیر ہے۔ اس کے دس سال بعد دوسری جلد ۱۹۶۶ء میں الدار المصریہ للتالیف والترجمہ قاہرہ سے چھپی جو سورۃ ہود سے سورۃ الزمر تک کے حصے کی تفسیر ہے۔ پہلی جلد نہایت اہتمام کے ساتھ عمدہ ٹائپ اور اچھے کاغذ پر دار الکتب المصریہ نے اپنے روایتی انداز میں چھاپی تھی مگر دوسری جلد میں ان باتوں کا چنداں خیال نہیں رکھا گیا۔

محققین کے پیش نظر پانچ مخطوطے تھے جن کی تفصیل درجِ ذیل ہے۔

۱۔ سب سے قدیم نسخہ استنبول کے مکتبہ سلیمانیہ میں ۶۶ نمبر پر موجود ہے۔ بہت ہی قدیم کوفی خط ہے اور چوتھی

صدی ہجری کا لکھا ہوا ہے۔ اس نسخہ کے بعض حصوں پر تملکات اور سماعات درج ہیں۔ ان سماعات میں سب سے قدیم سماعت ۴۸۱ھ میں علی بن الحسین بن محمد بن الحسن بن ابراہیم المعروف بابن الطہرانی کی ہے۔ اس نے ابوعبداللہ محمد بن اسحٰق بن یحییٰ بن مندہ سے، اس نے محمد بن یعقوب الاصم نیشاپوری سے اور اس نے محمد بن الجہم السمری فراء کے شاگرد سے سُنا ہے۔ کتابت اچھی ہے۔ آخر میں ناقص ہے اور بعض مقامات پر کرم خوردہ بھی ہے۔ یہ نسخہ سورۃ الانسان پر ختم ہوتا ہے۔ اس نسخے میں ۲۲۲ ورق ہیں اور ایک صفحے پر ۲۴ سے ۲۸ تک سطریں ہیں۔ اس کا فوٹو سٹیٹ دارالکتب المصریہ میں نمبر ۲۴۹۸۶ ب میں موجود ہے۔

۲ - دوسرا نسخہ بھی استنبول ہی کے کتب خانے نور عثمانیہ کا ہے۔ مکتبہ میں اس کا نمبر ۳۲ ہے۔ ایک جلد میں ہے، ناقص الاوّل ہے۔ سورۃ الزمر سے شروع ہو کر قرآن کے آخر تک ہے۔ اس نسخہ پر کسی جگہ بھی تاریخ درج نہیں ہے۔ تقریباً چھٹی صدی ہجری کا لکھا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ الفاظ کی صحت اور اعراب کی طرف خاص دھیان دیا گیا ہے۔ اس نسخہ میں چند اوراق پر کچھ حضرات کا بلاغ مرقوم ہے۔ ایک ہی جلد میں ۱۵۱ اوراق پر مشتمل ہے ایک صفحے میں ۱۸ سے ۲۴ تک سطریں موجود ہیں۔ اس نسخے کا فوٹو سٹیٹ بھی دارالکتب المصریہ میں نمبر ۲۴۹۸۷ ب پر موجود ہے۔

۳ - تیسرا نسخہ بھی نور عثمانیہ ہی سے ہے۔ اس کا نمبر ۴۵۹ ہے۔ بہت ہی متاخر دَور کا لکھا گیا ہے۔ تقریباً بارہویں صدی ہجری کا معلوم ہوتا ہے۔ خطِ نسخ بہت عمدہ ہے۔ ایک ہی جلد میں ۱۸۹ اوراق پر مشتمل ہے۔ ایک صفحے پر تقریباً ۳۰ سطریں ہیں۔ اس کی تصویر بھی دارالکتب المصریہ میں نمبر ۲۴۷۷۱ ب پر موجود ہے۔

۴ - ایک نسخہ علامہ محمود شنقیطی کے کتب خانے میں بھی موجود ہے۔ یہ تو اسی صدی کے اوائل کا لکھا ہوا ہے۔ اس کے ۲۲۲ اوراق ہیں اور ایک صفحے پر ۲۲ سے ۲۵ تک سطریں موجود ہیں۔ نسخہ کے ابتدا میں علامہ شنقیطی نے اپنے ہاتھ سے وقف لکھا ہے۔ جلد ساز نے جلد باندھتے وقت اس کے اوراق آگے پیچھے لگا دیئے ہیں۔ یہ تبدیلی سورۃ الروم سے سورۃ احزاب تک ہے۔ باقی حصہ بالکل ٹھیک ہے۔ اب نسخہ دارالکتب المصریہ میں تفسیر کے نمبر ۱ پر موجود ہے۔

۵ - ایک اور نسخہ بھی علامہ شنقیطی مرحوم کے ہاں موجود تھا۔ وہ صرف سورۃ عبس سے آخر قرآن تک ہے۔ اس پر علامہ کی تملیک کا سن ۱۳۱۰ھ درج ہے۔ انہی ایام کی کتابت بھی ہے۔ اس کے صرف ۱۵ اوراق ہیں نسخہ اس وقت دارالکتب المصریہ میں تفسیر کے نمبر ۱۱ پر محفوظ ہے۔

اس تفسیر کی اشاعت کے جلیل القدر کام کا بیڑا ابتدا میں دارالکتب المصریہ نے اٹھایا تھا۔ دوسری جلد کی طباعت کے بعد یہ وعدہ موہوم نظر آنے لگا ہے۔ اس لئے کہ دوسری جلد ردی کاغذ پر خراب ٹائپ میں چھپی ہے ریں حالات ہم کچھ نہیں کہہ سکتے کہ معانی القرآن کی تیسری جلد کب منصۂ شہود پر آئے گی۔